مقرر تھا' جانے کا وقت مقرر نہیں تھا تو جو جوڑے جلدی رخصت ہو جاتے تھے' وہ تو اپنی خوشی سے خطرہ مول لیتے تھے۔ ایک کشور ہی نہیں' چند ایک اور دانے دیر تک بیٹھتے۔ جلدی جانے والے اپنے طور اطوار سے' اپنی نشست و برخاست سے ان کی محفل کے لیے غذا فراہم کر جاتے۔

جلد ہی لڑائیاں شروع ہو گئیں اور تو اور دو بہنیں لڑ پڑیں۔ جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ جمیلہ ہاشمی اور سائرہ ہاشمی اب ایک جنگل میں نہیں رہ سکتیں۔ لڑائیاں بھائیوں میں زیادہ ہوتی ہیں' ہابیل قابیل کے وقت سے ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ بہنیں بالعموم نہیں لڑتیں مگر ایک مرتبہ لڑ پڑیں تو پھر انہیں اللہ ہی ملائے تو ملیں۔

یوں سمجھئے کہ ہمارے ادب میں یہ بیبیوں کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ کبھی کا ختم ہو چکا تھا جب ایک طرف انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ گرم ہوتا تھا' دوسری طرف حلقہ ارباب ذوق کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ ادب اس وقت ایک زندہ طاقت نظر آتا تھا۔ انجمن تو جلد ہی سرکاری عتاب میں آ کر ختم ہو گئی اور ترقی پسند تحریک تتر بتر ہو گئی۔ حلقہ نے لمبی اننگ کھیلی۔ پھر اس پر بھی برے دن آئے۔ پہلے دو ٹکڑوں میں بٹا' پھر دونوں حلقوں کا بستر لپٹ گیا۔ اب مبارک احمد مسیحا بنے ہوئے تھے اور مردے میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر زمانہ بدل چکا تھا۔ اب زمانہ یہ تھا کہ جو لکھنے کے معاملہ میں سنجیدہ ہے' وہ گھر کے کونے میں بیٹھ کر لکھے۔ باہر ادب کی صورت یہ تھی کہ ایک طرف وہ ذریعہ حصول مراعات تھا' دوسری طرف نقل محفل۔ بیبیوں نے کیا خوب محفلیں سجائی تھیں کہ ہم خرما و ہم ثواب۔ شعر و افسانہ بھی اور کھانا دانہ بھی مگر ان محفلوں میں جلد ہی درہمی پیدا ہو گئی۔ من و سلویٰ کا حلقہ خاص منتشر ہو گیا۔

جعفری صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا۔ ادا جعفری اسلام آباد چلی گئیں۔ بہن نے بہن سے لڑ کر اپنی بزم الگ آراستہ کر لی اور اس زعم کے ساتھ کہ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے۔ گھروں کی دیوار سے جو دیوار ملی ہوئی تھی۔ پروانوں کو مشکل پیش آتی کہ اس گیٹ میں داخل ہوں یا برابر والے گیٹ میں۔ بہر حال من و سلویٰ والی مخلوق کا ٹھیکہ تھوڑا ہی تھا۔ شہر رنگ رنگ کے ادیبوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس پر مستزاد وہ مخلوق جو وقت ضرورت ادیب کے طور پر کام آتی ہے۔ تو اس بی بی کو ہم نفس وافر مقدار میں میسر آ گئے۔

گھریلو ادبی محفل کا جو نسخہ لاہور میں تیار ہوا تھا' وہ ادا جعفری کے واسطے سے اسلام آباد اور اسلام آباد سے کراچی پہنچا۔ اسلام آباد میں بیٹھ کر انہوں نے ''سلسلہ'' کے نام سے اسی والی نہج پر محفلوں کا یہ سلسلہ شروع کیا۔ وہاں جا کر اس کاروبار میں ایک نیا پیچ پڑا۔ آپ جانیں کہ اسلام آباد تو گریڈوں کا شہر ہے۔ میل ملاقاتیں اسی حساب سے ہوتی ہیں۔ یوں انور الحسن جعفری بہت بھلے آدمی تھے۔ افسرانہ ٹھسا ان کے یہاں دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ یاروں کے یار۔ ادب کے رسیا' خود بھی قلم گاہے گاہے چلاتے تھے۔ یاروں

کے چند ایک خاکے لکھے اور خوب لکھے مگر تھے تو بہر حال افسر اور سیکرٹری کی سطح کے افسر۔ ان دنوں شاید کیبنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کے یہاں جو ادیب جمع ہوئے' وہ نادانستہ بالعموم وہ تھے جو ساتھ میں افسر بھی تھے۔ ساتھ ساتھ جو ادب کے رسیا یہاں پہنچے' وہ بھی کسی نہ کسی طرح اسی افسر طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر میں جو سرگرم ادیب تھے' ان میں سے تو اکا دکا ہی کوئی بڑا افسر ہوگا' باقی تو سب چھوٹے گریڈ والے ہی تھے۔ انہوں نے ''سلسلہ'' کے خلاف لام بندی شروع کر دی۔ یہ تھا لاہور اور اسلام آباد کا فرق۔ لاہور میں من وسلویٰ کے حلقہ میں جو ادیب جمع ہوئے' وہ اطمینان سے کھاتے پیتے اور ادب بگھارتے رہے۔ لاہور کے باقی ادیبوں نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ کسی کو مہمان بطور بلایا تو وہ وہاں چلا گیا مگر اسلام آباد کے ادیبوں کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔

اسلام آباد ادیبوں کو اس وقت ممتاز مفتی کی قدر معلوم ہوئی۔ اصل میں اس وقت انہیں ایک جانے مانے سینئر ادیب کی اشد ضرورت تھی۔ بس انہوں نے مفتی صاحب کو اپنا بزرگ مانا اور ان کے سائے میں اپنا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی ایک دفعہ شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ادب کی ڈشیں تو ویسی ہی تھیں جیسی اسلام آباد میں تیار ہو سکتی تھیں' باقی دستر خوان انواع واقسام کی ڈشوں سے آراستہ تھا اور ہر ڈش خوب اور مرغوب۔

ہماری بیچاری آپا ادا جعفری بیگم حجاب کی بھی بری بنیں اور اسلام آباد میں بھی آنکھوں دانتوں پر چڑھیں۔ بیگم حجاب کو غصہ اس بات پر تھا کہ من وسلویٰ تو خاص ان کی ایجاد تھی' ادابی نے ان کی اجازت کے بغیر اس کا نام بدل کر اپنا ٹھپہ لگایا اور اسلام آباد میں چالو کر دیا۔ اس روز سے انہوں نے ادا جعفری کو بے وفا چڑیا کہنا شروع کر دیا۔

مگر خیر کراچی جا کر ''سلسلہ'' کے سارے داغ دھل گئے۔ یہاں ادا جعفری کے گرد جو ادیب اکٹھے ہوئے' وہ کم وبیش سب ادیب ہی تھے۔ کسی کی افسرانہ حیثیت تھی بھی تو اس میں افسرانہ بو نہیں تھی جو اسلام آباد بیوروکریٹ کا طرہ امتیاز ہے۔ مشفق خواجہ' مشتاق یوسفی' شان الحق حقی' جمیل جالبی۔ آپ ان میں سے کس پر انگلی اٹھا سکتے ہیں۔

دوسرا خیر کا پہلو یہ تھا کہ یہاں سلسلہ میں لاہور کی طرح بیبیوں کی ریل پیل نہیں تھی۔ نہ کوئی کشور ناہید' نہ کوئی جمیلہ ہاشمی۔ ادیبوں کی بیگمات بھی مجھے تو بالعموم امن پسند ہی نظر آئیں۔ تو یہاں لاہور والا نسوانی فساد پیدا نہیں ہوا۔

ادھر لاہور میں بیگم حجاب چند برس خاموش بیٹھی رہیں مگر پھر انہوں نے جھرجھری لی۔ اب کے انہوں نے بہت احتیاط برتی۔ پچھلے تلخ تجربے کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے من وسلویٰ کا دائرہ محدود رکھا۔ صرف انہیں اکٹھا کیا جن کی وفاداریاں طے شدہ تھیں۔ میں ان کا پرانا نیاز مند' صلاح الدین محمود نفیس وشائستہ آدمی اور سراپا ادب' شیخ منظور الٰہی سے دیرینہ وضع دارانہ تعلقات' جمیلہ ہاشمی اللہ

کو پیاری ہو چکی تھیں۔ کشور کے کانوں میں انہوں نے بھنک نہیں پڑنے دی اور ہاں نثار عزیز۔ نثار عزیز اسلام آباد میں تھیں تو وہاں ادا جعفری کا دست بازو اور سلسلہ کی رکن رکین۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنی حجاب آپا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان کی مریدنی خاص بن گئیں۔

تو اب من وسلویٰ پر بیگم حجاب کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ کہیں دن تو ہم کہیں دن' وہ کہیں رات تو ہم کہیں رات۔ جاوید قریشی کو رکن بنایا گیا تھا مگر جب وہ پنجاب کے چیف سیکرٹری بن گئے تو وہ غیر حاضر رہنے لگے۔ بیگم حجاب نے فوراً کاغذی کارروائی کی اور حلقہ سے انہیں خارج کر دیا۔ مگر شیخ منظور الٰہی بہت قرینے کے آدمی نکلے۔ جب بینظیر حکومت کے ختم ہونے کے بعد عبوری حکومت میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو من وسلویٰ کے احباب کو وزیر اعلیٰ کے ڈنر میں مدعو کیا اور معذرت کی کہ اب وہ تھوڑے عرصے تک من وسلویٰ میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ چھٹی کی درخواست منظور ہوئی۔ مگر خیال تھا کہ چھٹی لمبی ہو گی۔ مگر اس وقت کے صدر فاروق لغاری کی بے بصیرتی کی وجہ سے عبوری حکومت کا زمانہ مختصر ہی رہا۔ شیخ صاحب جلدی واپس آ گئے۔

جاوید قریشی کی رخصتی سے پیدا ہونے والے خلا کو حمید اختر نے پر کیا۔ مگر کمی شاعر کی پڑی تھی۔ حمید اختر اس کمی کو کیسے پورا کرتے۔ یہ کمی ظفر اقبال کو لا کر پوری کی گئی۔ ظفر اقبال یاروں کے حلقہ میں بدنام ہوں گے۔ یہاں تو انہوں نے کوئی فساد پیدا نہیں کیا مگر پھر بیگم حجاب کی صحت بھی تو جلد ہی جواب دے گئی۔ وہ بستر سے لگ گئیں اور من وسلویٰ کی نشستیں موقوف۔ بلیوں کی انجمن تو پہلے ہی درہم برہم ہو چکی تھی۔ اب من وسلویٰ کی محفل بھی اجڑ گئی۔ میں نے باتوں باتوں میں یونہی پوچھ لیا کہ ''اب آپ کے یہاں بلیاں نظر نہیں آتیں۔''

اس پر بہت افسردہ ہوئیں۔ بولیں ''انتظار صاحب! بلی آدمیوں سے بڑھ کر خدمت مانگتی ہے۔ میں اب تھک گئی ہوں۔ بلیوں کی خدمت نہیں کر سکتی۔''

آخر میں بس ایک بلی رہ گئی تھی۔ وہ شاید اس بلی کی اپنی سعادت مندی تھی۔ بیگم حجاب کو تو اب اپنا وجود دوبھر لگتا تھا۔ بلی کی دیکھ بھال کیا کرتیں۔ بس یہ اس بلی کا پاس وفا تھا کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہ شاید ہماری ان سے آخری ملاقات تھی۔ نثار عزیز' اصغر بٹ بھی ساتھ تھے۔ ہم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے۔ اکیلی وفا شعار بلی نے آ کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ افسردہ نظروں سے ہمیں دیکھا' پھر ہمارے بیچ آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔ جیسے بیگم حجاب کی طرف سے معذرت کر رہی ہے۔ بیگم حجاب اب اس قابل نہیں رہی تھیں وہ چل کر یہاں آ سکتیں ورنہ پہلے تو جیسا بھی حال ہوتا' اسی قرینے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ہمارے پاس آ کر بیٹھتی

تھیں۔ آج ہمیں خود ان کے کمرے میں جانا پڑا۔ نقاہت طاری تھی۔ مشکل سے آنکھیں کھولیں اور اچانک ایک سوال کیا ''انتظار صاحب! آپ خدا کو مانتے ہیں؟''

''جی' مانتا ہوں اور آپ؟''

اس پر چپ ہو گئیں۔ تامل کے بعد بولیں ''جب میں صبح کو اٹھتی ہوں تو اس وقت تو خدا پر میرا ایمان برقرار ہوتا ہے مگر'' رکیں' پھر بولیں ''دن ڈھلتے ڈھلتے مجھے وسوسے آن گھیرتے ہیں۔ شام کو میں اس کے وجود سے منکر ہو جاتی ہوں۔''

اسی رو میں انہوں نے چند اور باتیں کہیں۔ میں نے پوچھا ''آپ کو آخر اللہ میاں سے شکایت کیا ہے؟''

''بہت شکایتیں ہیں۔ دیکھئے انتظار صاحب! موٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو مکینک ٹھوک پیٹ کر کے اسے چالو کر دیتا ہے اور ہمیں تو اللہ نے خود بنایا ہے۔ ہمارے سارے کل پرزے اس کی نظر میں ہیں۔ سو اگر ہمارے کسی پرزے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے تو اسے اس خرابی کو درست کر دینا چاہیے۔ یہ اس کا فرض ہے۔ آخر جب اس نے مجھے دو ٹانگیں دی ہیں تو میں کیوں چل پھر نہیں سکتی؟''

یہ بیگم حجاب سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ شاید ان کی شکایت دربار الٰہی تک پہنچ گئی تھی۔ بات کسی ایک کل پرزے کی خرابی کی نہیں تھی' معاملہ بہت آگے جا چکا تھا۔ اللہ میاں نے پھر انہیں اپنے پاس ہی بلا لیا۔ رومانی عہد کی ایک روح جو ہمارے درمیان بھٹکتی رہ گئی تھی' اس غیر رومانی زمانے میں لمبا وقت گزار کے آخر کے تئیں سدھار گئی۔

◆◆◆

سیاسی مبصر، منجم، افواہ ساز سب ہار گئے

جنرل ضیاء الحق ہنوز دندنا رہے تھے۔ ان کا جرنیلی بندوبست بھی زوروں میں جا رہا تھا۔ سیاسی مبصر' افواہ ساز' نجومی سب نے اپنی اپنی سی کر دیکھی۔ جس جس کے ترکش میں جتنے تیر تھے اس نے سب چلا ڈالے۔ ضیاء الحق کا بال بیکا نہیں ہوا۔ پورا ملک ہی افواہوں' سیاسی قیاس آرائیوں اور منجمانہ پیشین گوئیوں کی زد میں تھا۔ پھر بھی کم از کم لاہور شہر کی حد تک ٹی ہاؤس کو ایک گونہ امتیاز حاصل تھا۔ شہر میں جس وکیل' جس صحافی' جس پروفیسر کو جو افواہ یا جو پیشین گوئی دستیاب ہوتی یا اس نے بی بی سی پر جو مطلب کی بات سنی ہوتی یا ٹائم یا نیوز ویک میں پڑھی ہوتی' اسے لے کر ٹی ہاؤس پہنچتا کہ شہر میں ایک یہ ٹھکانا تھا یا منڈی جہاں اس طرح کے ہر مال کی بہت کھپت تھی۔ ان دنوں ٹی ہاؤس میں کچھ زیادہ ہی مجمع رہتا تھا۔ وہ زمانہ تو کبھی کا گزر چکا تھا' جب یہاں زور و شور سے بحث ادبی مسائل پر ہوا کرتی تھی۔ بین الاقوامی صورتحال ہو یا ملک کا سیاسی احوال بس ضمنی طور پر ہی زیر بحث آتا تھا لیکن ادب اب پس منظر میں چلا گیا۔ کہاں کی رباعی' کہاں کی غزل' اب تو مارشل لاء اعصاب پر سوار تھا۔ ہر پھر کر وہی ایک چیک کہ پاکستان کو جرنیل صاحب سے رہائی کب مل رہی ہے؟ ایسے میں کیا ادیب' کیا غیر ادیب۔ جس کے پاس کوئی خبر' کوئی افواہ' کوئی پیشین گوئی' کوئی ٹوٹکا ہوتا' اسے ٹی ہاؤس کی میزوں پر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ محض اور صرف ادب پر تکیہ کرنے والوں کے لیے اب یہاں کسی میز پر کوئی جگہ نہیں تھی۔ سوز اہد ڈار کو بھی اپنی کتاب بغل میں داب کر یہاں سے کنارہ کر کے گھنٹوں کے حساب سے باہر فٹ پاتھ کے جنگلے کے سہارے کھڑا رہنا پڑتا۔

اس عالم میں یار عزیز احمد بشیر نے ایک سیاسی مبصر کی حیثیت سے ٹی ہاؤس میں قدم رکھا اور دیکھتے دیکھتے اپنے گرد معتقد سامعین کا ایک مجمع جمع کر لیا۔ اس کے تجزیے خالص مارکسی ہوتے تھے اور ان کی رو سے ضیاء الحق کا فوری زوال صاف صاف نظر آتا تھا۔ اس لیے ان میں بہت جان اور بہت اپیل تھی۔ احمد بشیر کو جب میں نے ''امروز'' میں دیکھا تھا تو اس وقت وہ ترقی پسندوں سے دور اور ممتاز مفتی سے قریب تھا۔ سو جب عارف عبدالمتین کو اپنے مارکسی جوش خروش کی بدولت ادب لطیف کی ادارت سے ہاتھ دھونے پڑے تو وہ مجھے ممتاز مفتی کے اس غصے میں برابر کا شریک نظر آیا تھا جو مفتی صاحب کے ادب لطیف کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے عارف عبدالمتین کے خلاف پیدا ہو گیا تھا مگر تب سے اب تک زمانہ بہت بدل چکا تھا اور ہم میں سے کتنوں کی فکر و نظر میں بڑی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ شاید میں خود بھی اب اس طریقہ سے تو نہیں سوچتا جس طرح اس زمانے میں سوچتا تھا۔

اب احمد بشیر کا ایمان اور ایقان مارکسیت میں تھا اور اس فلسفہ میں اس نے اتنی دسترس بھی پہنچائی تھی کہ اپنے ماسکو کے سفر سے فتح مند واپس آیا اور اب جب ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر پاکستان کی صورتحال کا شدہ مارکسی تجزیہ کرتا تو یاروں کو ضیاء الحق کا انجام کتنا قریب نظر آتا مگر جرنیل سخت جان نکلا۔ وہ احمد بشیر کے سارے مارکسی تجزیوں کو سہہ گیا۔ احمد بشیر کے تجزیے لمبے کھنچتے چلے گئے۔ ان میں تکرار کا رنگ پیدا ہونے لگا۔ ٹی ہاؤس کے عجلت پسند سامعین بے اطمینان نظر آنے لگے۔

تب احمد بشیر نے مقامی صورتحال کے تنگ دائرے سے نکل کر بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینا شروع کیا اور تب اسے احساس ہوا کہ پاکستان کی صورتحال کا جائزہ اسے بین الاقوامی سیاق وسباق میں لینا چاہیے تھا۔ صحیح نتیجہ اسی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا۔ بین الاقوامی افق پر اسے ایک عالمی جنگ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس امکان سے اس کے تجزیوں میں ایک نئی امید کی لہر دوڑ گئی۔ استدلال کچھ اس طرح کا تھا کہ یہ عالمی جنگ بہت خوفناک ہوگی۔ ایسا طوفان اٹھے گا کہ سامراجی طاقتوں کو بہا کر لے جائے گا۔ کسان مزدور ایک بے پناہ طاقت بن کر ابھریں گے۔ ملکوں ملکوں انقلاب آئیں گے۔ ضیاء الحق جیسے سامراج کے پالے ہوئے ڈکٹیٹر اس طوفان میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔

اس تجزیے سے سمجھ لو کہ سوکھے دھانوں پہ پانی پڑ گیا۔ ایک مرتبہ پھر دلوں میں امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ صرف زاہد ڈار کو اس تجزیے نے پریشان کیا۔ احمد بشیر نے عالمی جنگ کا نقشہ اتنا خوفناک کھینچا تھا کہ وہ دہل گیا۔ اس نے اپنے Pacifist ہونے کا اعلان کیا اور بولا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ تو اس انقلاب کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔ انسان ہی زندہ نہ رہے تو ایسے انقلاب کا فائدہ کیا ہے۔''

احمد بشیر نے نحیف جثے والے زاہد ڈار کو بہت حقارت سے دیکھا ''تیری جان کی کیا حیثیت ہے۔ انقلاب جب آتا ہے تو ایسے بہت سے کیڑے مکوڑے مر جاتے ہیں اور انقلاب میں بہر حال جانیں تو جاتی ہیں۔''

''کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''

انقلاب کا یہ تصور زاہد ڈار کو تو نہیں بھایا' باقی یار بہت پر امید نظر آ رہے تھے مگر عالمی جنگ اب ہوتی ہے نہ تب ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر ٹی ہاؤس میں بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ تب احمد بشیر نے ایک شام میز پر بیٹھتے ہی یہ سنسنی خیز اعلان کیا کہ ''لو بھئی عالمی جنگ سر پر آ گئی۔ 15 دسمبر کو شروع ہو جائے گی۔''

''15 دسمبر کو؟'' سب کے دل بلیوں اچھلنے لگے۔ یہ دسمبر 1979ء کا پہلا ہفتہ تھا۔ گویا ایک ہفتہ بعد عالمی جنگ کا پروگرام شروع ہونا

تھا۔

زاہد ڈار کو یقین نہیں آیا۔ اس نے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ بڑا سوال یہ اٹھایا کہ 15 دسمبر کی حتمی تاریخ جو دی گئی ہے' وہ کیسے طے ہو گئی؟

احمد بشیر نے وضاحت کی کہ ''عالمی صورتحال کا جو میں نے تجزیہ کیا ہے' وہ بھی یہی کہتا ہے اور نجوم بھی یہی کہتا ہے۔''

''وہ کونسا نجومی ہے جس نے یہ تاریخ دی ہے۔''

تب گولر کا پیٹ پھٹا ''کل میری شبلی بی کام سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے ستاروں کا حساب دیکھ کر بتایا ہے کہ 15 دسمبر کو عالمی جنگ شروع ہو جائے گی اور شبلی بی کام نے ستاروں کے حساب میں آج تک کبھی غلطی نہیں کی۔''

شبلی بی کام خوب آدمی تھے۔ عالمگیر اور نیرنگ خیال کے وقتوں سے ہم ان کا نام ان رسالوں میں پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ''آفاق'' کے زمانے میں انہیں دیکھ بھی لیا مگر وہ اس اخبار کے آخری ایام تھے' جب وہ یہاں آئے تھے۔ اس لیے میں انہیں زیادہ دیکھ نہیں پایا۔ ہاں اسی زمانے میں انہوں نے ایم کام کیا تھا اور ان کا نام اچانک ایک بحران سے دوچار ہو گیا۔ وہ اس زمانے کے بی کام تھے' جب فلمی اشتہاروں میں لیلا چٹنس کے نام کے آگے بی اے اور ونمالا کے نام کے آگے بی اے بی ٹی لکھا جاتا تھا اور ''ساقی'' کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی بی اے تھے۔ اس زمانے کا ایم اے تو مجھے ایک ہی یاد آ رہا ہے۔ کرشن چندر ایم اے۔ رفتہ رفتہ ناموں سے یہ سرخاب کا پر غائب ہو گیا مگر شبلی بی کام کے نام کی ترکیب میں بی کام ایسا کھپا کہ نام کا جزو لاینفک بن گیا۔ اب اچانک انہوں نے ایم کام کر لیا تھا اور سوال یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ نام میں سے بی کام کو نکال کر ایم کام کا ٹانگ کیسے جڑا جائے مگر جلد ہی پتہ چل گیا کہ جس طرح کرشن نگر کو اسلام پورہ نہیں بنایا جا سکتا' اسی طرح شبلی بی کام کو شبلی ایم کام نہیں بنایا جا سکتا۔

سو شبلی بی کام' ایم کام ہو جانے کے بعد بھی شبلی بی کام ہی رہے۔ بس فرق اتنا پڑا کہ اب انہوں نے ''پاکستان ٹائمز'' میں انگریزی میں اقتصادیات پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں ان کی یہی مصروفیت تھی مگر احمد بشیر کو ان کے اقتصادیات تجزیوں سے زیادہ ان کے نجوم نے متاثر کیا۔ عالمی جنگ سے انہیں بھی بہت شغف تھا۔ کتنی مرتبہ وہ ستاروں کا حساب لگا کر عالمی جنگ کی پیشین گوئی کر چکے تھے مگر ہر مرتبہ ان کے حساب میں کوئی بال برابر کا فرق پڑ جاتا تھا اور اس لیے جنگ سے ہر مرتبہ ہم بال بال بچ جاتے تھے۔ یوں سمجھئے کہ ان کے ستاروں کے حساب میں جو بال برابر کی کسر چلی آ رہی تھی' اس کی وجہ سے دنیا ابھی تک تہہ و بالا ہونے سے بچی ہوئی تھی مگر اس مرتبہ ان کے ستاروں کے حساب کو احمد بشیر کے سیاسی تجزیئے کی بھی کمک حاصل تھی۔ سوئی ہاؤس میں یہ طے سمجھا جا رہا تھا کہ 15 دسمبر

کو عالمی جنگ برپا ہونے والی ہے۔

اس برس ٹی ہاؤس میں 15 دسمبر کا بڑی شدت سے انتظار کیا گیا۔ ایک ایک دن پہاڑ بن گیا مگر 15 دسمبر آئی اور گزر گئی۔ جنگ چھڑنے کی کوئی خبر نہیں آئی اور اس شام احمد بشیر نے بھی ٹی ہاؤس آنا مناسب نہیں سمجھا۔ یار بہت مایوس ہوئے۔ احمد بشیر کی سیاسی بصیرت اور شبلی بی کام کی ستارہ شناسی دونوں کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ دوسرے تیسرے دن جب احمد بشیر نے یہاں صورت دکھائی اور اس سے تابڑ توڑ سوال کیے گئے تو اس نے زچ ہو کر جواب دیا کہ ''فوجیں تو مقابل آ کھڑی ہوئی تھیں۔ اب اگر وہ آگے قدم نہ بڑھائیں تو اس میں ستاروں کا کیا قصور ہے اور میرے سیاسی تجزیے کی کیا خطا ہے؟''

اسی ہنگام ایک وکیل صاحب ایک اولیائی شان کے ساتھ یہاں نمودار ہوئے۔ انہوں نے تابڑ توڑ ایسی ہنگامہ خیز پیشین گوئیاں کیں کہ انقلاب کے بھوکے احمد بشیر سے ٹوٹ کر ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق کے زوال کی جو انہوں نے پیشین گوئیاں کیں' ان میں انہوں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ تاریخ کا تعین نہیں کیا مگر ایک پیشین گوئی کرتے ہوئے سامعین کی بے چینی اور بے صبرے پن کو دیکھ کر ان سے چوک ہو گئی۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ ایک ہفتے کے بعد ہندوستان میں مارشل لاء لگ جائے گا۔

اس پیشین گوئی میں یاروں کے لیے تسکین کا بہت سامان تھا۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ ہندوستان کی مصیبت کو دیکھ کر ہمیں اپنی مصیبت گوارا نظر آنے لگی جیسے ہمسایہ کی مصیبت سے ہماری مصیبت کی تلافی ہو گئی ہو۔ اگر ہمارے یہاں مہنگائی ہے تو چلو کوئی حرج نہیں' ہندوستان میں بھی تو مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔ بس کچھ اسی قسم کی تسکین کا سامان اس پیشین گوئی میں تھا تو ایک ہفتہ اس خوشی اور انتظار میں گزرا مگر ہفتہ گزرا' عشرہ گزرا' پندھرواڑہ گزرا۔ ہندوستان میں مارشل لاء نہیں لگا۔ بس اس کے ساتھ وکیل صاحب کا ٹی ہاؤس میں زوال ہو گیا۔

سو کتنے سیاسی مبصر اور منجم ضیاء الحق کے زوال کی پیشین گوئیاں کرتے ہوئے آئے' دم بھر کے لیے چمکے اور ماند پڑ گئے۔ ان پیشین گوئیوں نے یاروں کی تسکین کا سامان بہت فراہم کیا مگر جرنیل کا کچھ نہیں بگاڑا۔ جس طرح ایم آر ڈی کی شوراشوری نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ جرنیل صاحب کی سیاست زوروں پر جا رہی تھی۔ پاک ہند تعلقات کے معاملہ میں ان کی کرکٹ ڈپلومیسی نے شہرت پائی۔ یہ ڈپلومیسی کرکٹ کو راس آئی۔ ہندوستان پاکستان کے بیچ کرکٹ میچ زور و شور سے ہوئے۔ تھوڑا بھلا ادیبوں کا بھی ہو گیا۔ کرکٹ کے طفیل ادیبوں کو بھی تھوڑا آنے جانے کا موقع مل گیا۔ سیمیناروں' مشاعروں کے بہانے کچھ ادیب یہاں سے وہاں گئے۔ سیمیناروں کی تو ہمارے یہاں روایت ہی نہیں ہے۔ مشاعروں کے بہانے البتہ کتنے شاعر وہاں سے یہاں آئے مگر مشاعروں کا شہر تو

اصل میں کراچی ہے۔ لاہور نے تو زمانہ ہوا اس کاروبار سے فراغت حاصل کر لی تھی۔

بہانے بہانے کچھ ادیب لاہور بھی پہنچے مگر دھوم جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور رام لال کی ہوئی' وہ پھر کسی کو میسر نہیں آئی۔ رام لال بیچارے سیدھے سادھے افسانہ نگار مگر اس شہر میں کیا ان کی آؤ بھگت ہوئی۔ یہاں آ کر انہوں نے اعلان کیا کہ میں تو میانوالی کی مٹی ہوں۔ اس مٹی کو چھوئے بغیر کیسے واپس چلا جاؤں۔ میانوالی والے انہیں میانوالی لے گئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں ان کا زبردست استقبال ہوا۔ جب وہ واپس ہندوستان چلے تو دو قیمتی تحفے ان کے ساتھ تھے۔ ایک تو میانوالی کی مٹی سے بھری ہنڈیا اور دوسرا ہیما مالنی کے نام مبارک احمد کا منظوم محبت نامہ۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جب پہلی مرتبہ کراچی ہوتے ہوئے لاہور پہنچے تو ان کے استقبال کا خاص اہتمام ہوا۔ کتنی کاروں کا قافلہ مہمان کو لینے کے لیے ائیر پورٹ جائے گا' لنچ کہاں ہوگا' سہ پہر کو چائے اور پھر تقریب کا اہتمام کیا ہوگا اور رات کو ڈنر کس گھر ہوگا۔ اگلی صبح پہلے شاہی قلعہ' پھر مقبرہ جہانگیر' پھر شالامار باغ' پھر میوزیم اور پھر لنچ سہ پہر کو۔ تقریب کہاں اور کیسے۔ ڈنر کا اہتمام کس کی طرف سے۔ جب کشور نے اس نہج پر پروگرام ترتیب دے کر میرے اور ریاض انور کے حوالے کیا تو میں نے دل میں کہا کہ یا اللہ ہندوستان سے یہ کوئی ادیب آ رہا ہے یا وزیر اعظم ہند تشریف لا رہے ہیں۔ ہم ٹھہرے اناڑی مگر کشور نے تو غیر ملکی مہمانوں کے لیے سرکاری انتظامات دیکھ رکھے تھے۔ اسی نہج پر اس نے یہ پروگرام ترتیب دیا اور مجال ہے کہ شیڈول میں ذرا بھی فرق پڑا ہو اور نارنگ صاحب ٹھہرے تقریر اور تحریر دونوں کے بادشاہ۔ شہر کو لوٹ لیا۔ بڑا کھانا کشور کے یہاں کشور باہر سے آنے والے مہمان کی تواضع صرف کھانے وانے سے نہیں کرتی بلکہ محفوظ ذخیرے میں سے کچھ شاعر نام کے دانے بھی پیش کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ انواع و اقسام کے کھانے کھائے۔ اب یہ مزہ بھی چکھو مگر جس شاعر کو یہاں پیش کیا' وہی بعد میں دشمن جان بن گیا۔

بیگم نارنگ کو اچانک یاد آیا یا سمجھ لو کہ اچانک ہمیں بتایا کہ میں نے تو اسی شہر میں آنکھ کھولی تھی۔ جس محلہ میں تھا ہمارا گھر' اس کا نام تھا قلعہ گوجر سنگھ۔ میں اپنا گھر دیکھوں گی۔ ہم نے کہا کہ بھابھی صاحب' ہم آپ کو قلعہ گوجر سنگھ لے تو چلیں لیکن یہ سوچ لیں کہ دہائیاں بیت چکی ہیں' وہاں کا نقشہ کچھ سے کچھ ہو چکا ہوگا۔ آپ اپنا گھر پہچان بھی لیں گی۔ اعتماد سے بولیں کہ پہچان لوں گی تو ہم انہیں لے کر قلعہ گوجر سنگھ پہنچے۔ گلی گلی گھومے' ایک ایک گھر کو غور سے دیکھتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔ اچانک ایک گھر کو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ غور سے در و دیوار کو دیکھا اور پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ پھر سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

صاحب مکان نے باہر نکل کر تعجب سے ہمیں دیکھا۔ میں نے اور ریاض انور نے بڑھ کر انہیں سمجھایا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔

یہاں کسی کی نیت بد نہیں ہے۔ یہ ہندوستان سے ہماری مہمان آئی ہیں اور اپنا گھر ڈھونڈ رہی ہیں۔ بس اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اب جو آپ کا گھر ہے' کبھی یہ ان کا گھر تھا۔

''پھر باہر کیوں کھڑی ہیں۔ آپ انہیں اندر لے کر آئیں۔''

صاحب خانہ نے جلدی جلدی چائے کا اہتمام کیا۔ مکان بھی دکھایا اور چائے بھی پلائی۔

لیجئے اس ذکر سے میرے اندر کھد بد ہونے لگی۔ مجھے اپنی بستی' اپنی گلی' اپنا گھر یاد آنے لگا ہے۔ تو لاہور کو تھوڑی دیر کے لیے سلام۔

◆◆◆

بوئے آوارہ

میں جب علی گڑھ پریم چند سیمینار میں شرکت کی غرض سے گیا تھا تو ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بھی تھی کہ لگے ہاتھوں ڈبائی میں بھی جھانک آئیں گے اور اب میرے تصور میں وہ صبح جگمگانے لگی ہے۔ جب صبح ہی صبح میں اور عالیہ کار میں بیٹھ کر ڈبائی کی طرف چلے تھے۔ ابوالکلام قاسمی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ پورا راستہ میرے تصور میں پھیلتا جا رہا ہے۔ میں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ارے اتنے درخت ہیں یہاں سے وہاں تک اور اتنے پرندے رنگ رنگ کے۔ کوئی تو پہچانے گا مجھے۔ اے لو پرانی شناسائی نکل آئی۔ مقبرہ۔ میں چونکتا ہوں اچانک گردوپیش سے میرا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہ جو میرے دائیں سمت ایک شکستہ مقبرہ ہے اور دانپور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جب ہمارا اکہ ڈبائی سے چل کر دھول میں اٹا ہوا' کنکروں والی سڑک پہ دوڑتا ہوا جانے کتنا لمبا رستہ طے کر کے اس مقبرے کے قریب سے گزرتا تو ہم جان لیتے کہ بس اب دانپور آیا چاہتا ہے تو میں یہیں سے مڑ کر دانپور کی طرف کیوں نہ ہو لوں۔ اور ڈبائی؟ ارے ڈبائی کو دیکھنا اب ہماری قسمت میں کہاں ہے۔ جیسے گھوڑا دریا کنارے پہنچ جائے اور پھر پیاسا چلا آئے۔ کنارے کو تو چھو لیا تھا۔ کنارے ٹامک ٹوئیاں مار کر چلا آیا۔ بستی نے راستہ ہی نہیں دیا۔ دور ہی سے رستہ بتا دیا۔ بستیوں کو جذبات سے عاری مت جانو۔ روٹھتی ہیں تو پھر ایسا روٹھتی ہیں کہ نہ منائے منتی ہیں' نہ درشن دیتی ہیں۔

خیر اس وقت تو وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب سمجھ میں آ رہی ہے جو بستی خواب ہو جائے اور افسانہ بن جائے' وہ پھر ان بلندیوں سے نیچے نہیں اترتی۔ تو اب میں اس دیار میں خوابوں اور افسانوں ہی کے واسطے سے پہنچ سکتا ہوں۔ فرض کیجئے میں وہاں پہنچ جاتا مگر اس بستی میں تو پھر بھی نہیں پہنچتا۔ گھوڑا جب دوسری بار ندی میں منہ ڈالتا ہے تو وہ پہلی والی ندی نہیں ہوتی۔ وہ ندی تو گزر چکی ہوتی ہے' اب یہ دوسری ندی ہوتی ہے مگر مجھے تو اس اپنی بستی میں داخل ہونے کا راستہ ہی نہیں ملا۔ پریشان تھا کہ وہ دھرم شالہ' وہ آموں کا باغ' وہ شفاخانہ' وہ اس کے بیچ پھولا ہوا باغیچہ' وہ سب کہاں ہیں جن کے بیچ سے بستی میں داخل ہونے کا اور اپنے محلہ میں پہنچنے کا رستہ نکلتا تھا۔ وہ سب رستے' وہ پگڈنڈیاں کہاں بہہ گئیں۔ تب میں نے سوچا کہ اس بستی میں داخل ہونے کے دو راستے تو مجھے میسر ہیں۔ میرے خواب' میری کہانیاں' پھر میں یہاں اجنبی رستوں میں کیوں خراب ہو رہا ہوں۔ جو بستی خواب اور افسانہ بن جائے۔ پھر اسے اسی عالم میں رہنا چاہیے' سو میں فوراً ہی پلٹ لیا۔

دانپور کی طرف جاتا تو بھی یہی ہونا تھا۔ ادھر نہیں گیا تو اب اطمینان سے تصور کرتا ہوں کہ دانپور میں سب گلیاں' سب گھر جوں کے توں ہیں۔ اسی طرح شاد آباد ہیں اور وہ خواب جیسا گھر۔ عقب میں کھڑی بلند و بالا املی چھت پر اسی طرح جھکی ہوئی ہے۔ صحن میں کھڑے نیم کے پیڑ نے اسی طرح صحن کے بڑے حصے کو ڈھک رکھا ہے اور وہ ہمارے بزرگ اسی طرح بر میں شیروانی' سر پر ترکی ٹوپی' ہاتھ میں لام کی شکل والا بید' اپنی سفید داڑھی کے ساتھ تکیوں کے مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور صحن سے متصل لمبے چوڑے احاطے میں اسی طرح مرغیاں چگتی پھر رہی ہیں۔ بطخیں شور مچا رہی ہیں۔ کبوتر چھتری پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ اچھا تو مجھے بتانا ہی پڑے گا کہ اس بستی سے میرا کیا تعلق ہے۔ تو پھر اپنے کچھ بزرگوں کا بھی ذکر کرنا پڑے گا۔ چلو جہاں اتنے ذکر اذکار کیے ہیں' بقدر نمک یہ ذکر بھی سہی۔ یہ بزرگ ہمارے دادا جان دلشاد علی تھے۔ دوسرے دادا صادق علی خان بہادری کے ٹھسے کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ بنے باپوڑ میں بیٹھے تھے۔ اپنے دادا کو تو دیکھا نہیں' ان دو بزرگوں کو جو میرے والد کے ماموں ہونے کے ناطے ہمارے دادا تھے' خوب دیکھا۔ دونوں اپنے اپنے علاقے میں تھم کی طرح گڑے بیٹھے تھے اور بڑ کے پیڑ کی مانند ارد گرد پر چھائے نظر آتے تھے۔ دانپور والے دادا ایسے عامل کہ آس پاس کے قصبات و دیہات میں جس کسی پر جن آ جاتے' وہاں جا کر حاضرات کرتے اور دم کے دم میں جنوں کا قلع قمع کر دیتے۔ وہ تو یہ کہیے کہ بزرگوں کا تھوڑا سا علم ہی انہیں ملا تھا' پورا کیسے ملتا۔ جب ان کے والد بزرگوار بستر مرگ پر تھے تو ایک ننگ دھڑنگ درویش جانے کس طرف سے نمودار ہوا۔ آ کر ان سے چمٹ گیا اور ان کا سارا علم سمیٹ کر لے گیا۔

میرے والد کو جدی علم میں سے کچھ نہیں ملا۔ ملتا کیسے' عمر بھر قرآن و حدیث میں غرق رہے۔ پیری فقیری کو خلاف اسلام جانتے تھے۔ پکے شیعہ تھے مگر مزاج وہابیانہ پایا تھا۔ مجلسوں میں اس لیے نہیں جاتے تھے کہ وہاں سوز خوانی ہوتی تھی۔ سوز خوانی پر انہیں وہی اعتراض تھا جو ان کے قول کے مطابق حضرت ناصر الملت کو اعتراض تھا اور پھر کس ذاکر کو سننے کے لیے جاتے۔ سب ان کی دانست میں منقولات میں گھوڑے دوڑاتے تھے' معقولات میں صفر تھے۔ خود مجلس پڑھنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ وعظ دینے کا جو شوق تھا مگر امام باڑے میں قدم اس وقت رکھتے جب اطمینان کر لیتے کہ سوز ہو چکے اور پڑھتے کیا تھے' نہ فضائل علی ابن ابی طالب' نہ خلافت کے مسئلہ پر بحث۔ اس مسئلہ پر بحث وہ اپنے سنی المذہب ممیرے پھپھیرے بھائیوں بھتیجوں کے ساتھ کرتے تھے۔ منبر پر بیٹھ کر ان کے موضوعات مختلف ہوتے تھے۔ زمین ساکن ہے یا گردش کرتی ہے' خدا ہے یا نہیں ہے' قرآن حادث ہے یا قدیم ہے یا پھر مسئلہ تناسخ یا سود کا مسئلہ اور پھر بیان ہے کہ لمبا کھنچتا چلا جا رہا ہے۔ سامعین ایک ایک کر کے کھسکنے لگتے۔ مجھے لگتا کہ آخر میں بس میں ہی ایک سامع رہ جاؤں گا اور بیان اسی شان سے جاری رہے گا لیکن آخری عمر میں جانے کیا سنک سوار ہوئی کہ جلالی وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئے۔ اگر پورا

ہو جاتا تو ماموں کی ٹکر کے عامل ہوتے۔

ہمارے ہاپوڑ والے دادا جان ایسے کسی قصے میں نہیں پڑے۔ شرافت کے ساتھ سرکار انگلشیہ کی چاکری کر کے خان بہادر کا خطاب پایا۔ آخر میں آنریری مجسٹریٹ بن کر ہاپوڑ میں بیٹھے اور پورے خاندان کا ملجا و ماوی بن گئے۔ بیٹا (تصدق حسین) باپ سے بڑھ کر نکلا۔ خان بہادر کے ساتھ ادبی ای کا بھی خطاب حاصل کیا۔ جلدی ہی مرحوم ہو گئے۔

ارے یہ تو میں خاندانی تذکرہ کی راہ پر چل نکلا۔ تو دانپور اور ہاپوڑ دونوں موقوف اور ڈبائی کے متعلق تو میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ یہ بستی اب میرے حساب میں کسی اور اقلیم کا حصہ ہے۔ سو اس میں داخل ہونے کے راستے بھی اور ہیں۔ اوبڑ کھابڑ۔ یہاں میں سیدھے راستے پہ چل رہا ہوں مگر ایک گھر کا ذکر تو مجھے پھر بھی کرنا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی ابھی دلی میں خاک اڑا کر اور میرٹھ میں جھانک کر آ رہا ہوں۔ میرٹھ میں سب کچھ بدل گیا ہے' سوائے ریوڑیوں کے۔ دو ہی چیزوں کے دیکھنے اور چکھنے کی خواہش مجھے وہاں لے گئی تھی۔ اول ریوڑی' دوم میرٹھ کالج۔ بس تب سے میں اپنی طالب علمی کا زمانہ ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ وہ زمانہ ماضی ہوا۔ ہاں ایک کڑی ہے جو میرے اس زمانے کو آج کے زمانے سے ملاتی ہے۔ کرار صاحب مگر جب میں کرار صاحب کے متعلق سوچتا ہوں تو میرٹھ کالج بعد میں دھیان میں آتا ہے' پہلے ڈبائی کا وہ گھر یاد آتا ہے جسے ہم کھڑکی والا گھر کہتے تھے اور واقعی اس گھر کا دروازہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے دروازہ نہ ہو' بڑی سی کھڑکی ہو۔

اس گھر کے دروازے میں بالعموم سال بھر تالا پڑا رہتا۔ اصل میں اس گھر کے مکینوں نے پردیس کو آباد کر رکھا تھا۔

جب محرم کے دن قریب آتے تو میری والدہ جا کر یہ تالا کھولتیں۔ گھر کی جھاڑ پونچھ کرتیں۔ سفیدی پھیرنے کا انتظام کرتیں' خاص طور پر اس کوٹھڑی میں جہاں چاندرات کے آتے آتے علم سجائے جاتے۔ موم بتیاں روشن کی جاتیں۔ لوبان سلگایا جاتا۔ خاندان کی مجلسیں یہیں ہوتی تھیں اور اس خاندان کا معاملہ یہ تھا کہ شیعہ بس بقدر نمک تھے باقی سنی مگر اس طرح کے تنک بھر تشیع بھی طبیعتوں میں شامل تھا۔ برس کے برس مجلس اور تعزیہ داری کے لیے مناسب رقم بھجوا دیتے اور اپنی تشیع والی ذمہ داری سے فراغت پا لیتے۔ خاندان کے اندر ہی شادی بیاہ کی وجہ سے کچھ چتکبرے جوڑے بھی تھے کہ شوہر شعیہ' بیوی سنی۔ ایسے شوہروں میں سے اکا دکا کا شوہر سال کے سال اہتمام کرتے کہ بیوی کو گھر پر چھوڑتے اور بچوں کو لے کر محرم کے موقع پر آن موجود ہوتے۔ مقصود یہ ہوتا کہ اولاد کو محرم کے کلچر میں ایسا رچا بسا دو کہ وہ ماں کے اثر میں آ کر سنی نہ بن جائیں۔ سنی تو پھر بھی وہ بنتے تھے۔ بس اتنا ہی فرق پڑتا تھا کہ محرم دل میں گھر کر لیتا تھا۔ سال میں ایک مجلس کر دی اور کوئی منت مان لی۔ منت پوری ہو گئی تو سونے چاندی کا کوئی علم چڑھا دیا۔ مراد بھی پوری

ہوگئی' باپ کی روح بھی خوش ہوگئی۔

ہاں تو محرم کی سواری کے ساتھ پردیس سے سواریاں آنی شروع ہو جاتیں۔ اسی ہنگام ایک اکہ کھڑکی والے گھر کے سامنے آ کر رکتا۔ جو سواریاں اکے سے اترتیں' اس میں کچھ برقع پوش بیبیاں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان۔ بر میں کرتا اور چوڑے پائنچوں والا پائجامہ۔ بال لمبے لمبے کہ گیسو دراز کہیں تو بجا ہوگا۔

ایک بوڑھی بی بی نے مجلس میں بیٹھے بیٹھے دور صحن میں کھڑے اس نوجوان کو غور سے دیکھا اور تعجب سے کہا ''یہ فاطمہ کا پوت ہے؟''

برابر والی بی بی نے کہا ''ہاں خالہ! یہ کرار ہے۔ تم نے اسے پہچانا نہیں۔''

''اس نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ ڈوبا بالکل لٹا دھاری بنا ہوا ہے۔''

''خالہ! کرار فلسفی ہوگیا ہے۔''

بڑی بی طنز بھرے لہجہ میں بولیں ''مہربان علی نے بیٹے کو یہی تعلیم دی ہے۔''

بڑی بوڑھیوں کے لیے وہ مہربان علی تھے' ہمارے لیے بانا تایا۔ بس ایک جھلک سی دھیان میں ہے۔ اس جھلک میں بھی ان کا انگرکھا نمایاں ہے۔ انگرکھے میں نے دو ہی دیکھے۔ یہ انگرکھا یا اپنے والد کا انگرکھا۔ مگر ٹھسے والا انگرکھا وہ تھا جو محرم کے محرم نظر آتا۔ جب لکھنو سے ایک مرثیہ خواں اصغر لکھنوی وارد ہوتے۔ بر میں سفید براق چکن کا انگرکھا۔ سر پہ اسی چکن کی دو پلو ٹوپی۔ گز بھر چوڑے پائنچوں والا لکھنوی طرز کا پائجامہ۔ منبر پر بیٹھ کر پہلے دولھا صاحب کو یاد کرتے۔ بتاتے کہ استاد ان پر کتنی شفقت کرتے تھے۔ جو مرثیہ پڑھتے' وہ بھی دولہا صاحب ہی کی تصنیف ہوتا۔ مرثیہ کیا پڑھتے تھے۔ ڈرامہ پیش کرتے تھے۔ رزم' بزم' مصائب' ہر بیان میں طاق اور ہر بیان اس شان سے کہ خود بھی جیسے کربلا پہنچے ہوئے ہوں اور ہمیں بھی ساتھ لے گئے ہوں۔ بیان کرتے تھے کہ تصویر کھینچ دیتے تھے کہ تلوار کیسے شقی کے خود پر پڑی۔ کس طرح فرق میں اتر کر تن تک گئی' تن سے گھوڑے کی پشت میں اتری۔ گھوڑے کی پشت سے اتر کر گاوزمین تک گئی۔ دولہا صاحب کے آتے آتے مرثیہ میں ساقی نامہ نے بھی تو جگہ پالی تھی۔ اصغر صاحب جب ساقی نامہ پر آتے تو بزم عزا' بزم مشاعرہ بن جاتی اور واہ واہ' سبحان اللہ' مکرر ارشاد کے شور سے امام باڑے کی چھت اڑتی نظر آتی۔ ساقی نامہ سے گریز' تلوار کی تعریف موقوف' گھوڑے کی مدح ختم' اب شہادت کا ہنگام ہے اور اصغر صاحب رزم و بزم سے گزر کر مصائب کے بیان پر پہنچ چکے ہیں۔

اصغر صاحب ایسا پڑھتے تھے تو دولہا صاحب کیسا پڑھتے ہوں گے۔ یہ مرثیہ خوانی تھی یا ڈرامہ کی پیشکش۔ ابتدائے عمر میں اصغر

صاحب کو کیا سنا کہ پھر کسی مرثیہ خواں کی مرثیہ خوانی نظروں میں جچی ہی نہیں۔ بخاری صاحب کی مرثیہ خوانی بھی اپنی خوبیوں کے باوصف بس غنیمت نظر آتی ہے۔

ارے ذکر کرار صاحب کا تھا' بیچ میں آ گئے اصغر صاحب۔ ابھی میں کرار صاحب سے پہلے تعارف کا ذکر کر رہا تھا۔ ذکر ان کے کرتے پائجامے کا تھا۔ پھر آگے چل کر دیکھا تو وہ کرتا پائجامہ خاکساروں والے کرتے' پائجامہ میں بدل چکا تھا۔ بیلچہ اس پر مستزاد۔ پھر میرٹھ کالج میں قدم رکھا تو ان کا استاد والا روپ دیکھا۔ چھٹیوں کے بعد جب کالج کھلتا تو مہینے بھر تک تو ان کی صورت ہی نظر نہ آتی۔ ان کے پیریڈ والے طلبہ بھٹکتے پھرتے۔ پتہ چلتا کہ ابھی واپس شہر ہی نہیں آئے ہیں۔ واپسی کے بعد بھی لازم نہیں تھا کہ پابندی سے کلاس لیں۔ پھر بھی طلبہ ان کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ ان کی غائب دماغی کے قصے سناتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ جتنے لیکچر دیتے' ان میں اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر دیتے۔ سچ پوچھو تو اس کالج میں انگریزی ادب کے پروفیسر صحیح معنوں میں دو ہی تھے۔ ایک پروفیسر مکرجی' ایک کرار صاحب اور کرار صاحب کو میں نے پہلے مجلسیں پڑھتے دیکھا۔ اس کلاس میں بیٹھ کر انہیں انگریزی ادب پڑھاتے دیکھا۔ بالعموم انگریزی شاعری کا پیریڈ لیتے تھے۔ پھر بی اے کے بعد انہیں اردو پڑھاتے بھی دیکھ لیا بلکہ زیادہ قرب اسی زمانے میں حاصل ہوا۔ میرٹھ کالج میں اردو کا ایم اے نیا نیا جاری ہوا تھا۔ ابھی اس کے لیے لیکچرار کا تقرر عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ کلاس کرار صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ گویا ہم نے اردو بھی انگریزی کے پروفیسر سے پڑھی۔

کرار صاحب اردو کی کلاس شام کو اپنے گھر پر لیتے تھے یہ گھر بھی خوب تھا۔ زنانہ حصہ تو مختصر ہی تھا۔ مردانہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ کمرے میں کتابیں بکھری ہوئی۔ انہیں کے بیچ خاکساریت کا کھڑاک پھیلا ہوا۔ ہم بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ کرار صاحب اس کھڑاک سے ذرا فراغت حاصل کریں اور ہماری کلاس لیں اور مجھے یہ اندیشہ ستاتا رہتا کہ کہیں اردو ادب اور بیلچہ آپس میں گڈمڈ نہ ہو جائیں۔

ویسے بیلچہ بھی اب اس گھر میں ایک انقلاب سے دوچار تھا۔ وہ زمانہ گزر چکا تھا جب اس گھر میں علامہ مشرقی کی کتابیں' کتابچے بکھرے نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں علامہ کی جو کتاب اچک کر پڑھ سکتا تھا' پڑھ لی تھی اور اس زمانے میں تو کیفیت یہ تھی کہ کرار صاحب جو مجلسیں پڑھتے تھے' وہ بھی سمجھ لو کہ علامہ کے تذکرہ کا شیعہ ورژن ہوتی تھیں۔ عزاداران حسین پریشان ہوتے کہ یہ کیسی مجلس ہے کہ ہم امام مظلوم کے لیے دو آنسوؤں سے بھی گئے۔ نہ ذکر مصائب' نہ فضائل مولا علی ابن ابی طالب نہ جنگ خیبر و خندق۔ خیر وہ بھی تھے جو کہتے تھے کہ ایک مجلس بے گریہ بھی سہی۔ اچھی باتیں تو سننے کو مل جاتی ہیں۔ ویسے گریہ کے حساب سے دیکھا جائے تو کرار

صاحب ایک ناکام ذاکر ہیں۔ ان پر تو خود رقت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر آرٹ تعلق کے ساتھ ایک بے تعلقی مانگتا ہے۔ اگر اسٹیج پر ہیرو محبت کو ایکٹ کرتے کرتے سچ مچ محبت شروع کر دے تو ڈرامہ تو گیا۔ کرار صاحب کی ذاکری میں یہی خامی ہے۔

خیر تو ذکر یہ تھا کہ اب اس گھر میں بیلچہ خود ایک انقلاب سے یا بغاوت سے دوچار تھا۔ علامہ مشرقی کا بستر یہاں سے لپٹ چکا تھا۔ اب اس گھر کی حیثیت یہ تھی کہ علامہ سے جو نوجوان بھی بغاوت کرتا (اور بغاوتیں مسلسل ہو رہی تھیں) وہ سیدھا اس طرف کا رخ کرتا۔ ان دنوں یہاں دو نوجوان پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ ایک نوجوان بالعموم نل پر بیٹھا اپنا جوڑا جو اسے اگلے دن پہننا ہوتا' دھوتا نظر آتا۔ دوسرا باتیں کرتا دکھائی دیتا۔ وہ ردف خان تھے اور یہ یونس منصور' دونوں نے علامہ سے نئی نئی بغاوت کی تھی۔ یونس منصور نے علامہ سے بدک کر اچھرہ سے رسہ تڑایا اور لاہور سے بھاگ کر میرٹھ میں اس گھر پہ آ کر دم لیا۔ اب یہاں سے ایک ہفت روزہ ''الامین'' نکلتا تھا جو خاکسار تحریک کے باغیوں کا آرگن تھا۔ وہ ''الامین'' کے ساتھ جتا ہوا تھا۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ گھر کا پھاٹک دھڑ سے کھلا اور ایک دراز قد شخص داخل ہوا۔ گورا چٹا۔ بر میں کھدر کا کرتا' تنگ موری والا پائجامہ۔ گلے میں تھیلا۔ علیک سلیک کرتے کرتے فرش پر نشست جمائی۔ تھیلا گلے سے اتار کر سامنے رکھا۔ کھول کر سامان پھیلایا۔ سامان کیا' کچھ پرانے تالے' چابیاں' ایک ہتھوڑی اور ایسے ہی کچھ اوزار۔ فوراً ہی ٹھوک پیٹ شروع کر دی اور ساتھ میں مسلمانوں کی حالیہ سیاست پر ایک لمبی گفتگو۔

میں نے جان لیا کہ اختر حمید خان ہیں۔ آخر ان کا ذکر اس گھر میں اور یہاں سے باہر بھی اتنا سن چکا تھا۔ استعفیٰ دے کر کلکٹری سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب قفل سازی کو پیشہ بنا رکھا تھا۔ سابق آئی سی ایس حال قفل ساز۔ پرانے تالوں کی مرمت بہت اچھی طرح کرتے تھے۔ کیسا ہی کھٹ بگڑا تالا ان کے پاس لے جاؤ' ٹھیک کر دیتے تھے۔ ملت کے کھٹ بگڑے تالے کو بھی اپنے حساب بہت ٹھوکا پیٹا۔ اس کاروبار میں ان کی کامیابی مشکوک تھی۔ اب وہ جامعہ ملیہ کے لیے پر تول رہے تھے۔

اس کے بعد کہیں شاید 1970ء میں وہ لاہور آئے تھے۔ یونس منصور کے طفیل میں بھی ان سے مل لیا۔ اس وقت ان کا مضمون دوسرا تھا۔ بدھ مت پر رواں تھے۔ شاعری کے باب میں کہنے لگے۔ ''اردو میں دو ہی بڑے شاعر ہوئے ہیں۔''

''کون کون سے؟'' مجھے تجسس ہوا۔

بولے ''کبیر اور تلسی داس۔''

میں نے کہا ''کبیر کی حد تک تو بات سو فیصدی درست نظر آتی ہے مگر رامائن کو میں نے پڑھنے کی بہت کوشش کی۔ اس کی زبان تو

بالکل پلے نہیں پڑتی۔ آخر میں نے اردو بول چال کے بیچ ہی آنکھ کھولی ہے۔ یہ اردو ہوتی تو کچھ تو سمجھ میں آتی۔"

بولے "کسی انگریز سے پوچھ کر دیکھو۔ چاسر کی زبان اس کی سمجھ میں آتی ہے تو کیا چاسر کی زبان انگریزی نہیں ہے۔"

میں ذہنی طور پر قائل ہونے کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ فوراً قائل ہو گیا۔ ہاں ان دو ناموں میں' میں نے ایک تیسرے نام کا اضافہ چاہا۔ میرا بائی کا۔ اس پر وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ اسے وہ بڑے شاعروں میں شمار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ان دنوں مشرقی پاکستان کا آشوب چل رہا تھا۔ ملک کے حالات ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کہنے لگے "مجھے اندیشہ یہ ہے کہ زمانہ ایسا آ رہا ہے کہ ہم ایوب خان کے زمانے کو بہت اچھے زمانے کے طور پر یاد کریں گے۔"

مگر جب پچھلے برسوں میں کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت رجائیت پسند دکھائی دیئے۔ موجودہ ابتری سے انہیں ایک نیا عہد طلوع ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں ٹھہرا قنوطیت پسند۔ ان کی یہ رجائیت مجھے بھلے وقتوں کے ترقی پسندوں کی رجائیت کی صدائے باز گشت محسوس ہوئی۔

ہاں تو ذکر کرار صاحب کا تھا اور دفتر الامین اور اپنی اردو کی کلاس کا۔ شہر کے کوئی وکیل صاحب آ نکلے' کوئی علامہ کا ستایا ہوا خاکسار آن دھمکا' کوئی پرانا شاگرد آن ٹپکا۔ کانگریس' مسلم لیگ' علامہ مشرقی کی نئی روش' رنگا رنگ موضوعات و مسائل زیر بحث ہیں۔ کرار صاحب جاری ہیں۔ ہم انتظار کر رہے ہیں کہ یہ لوگ جائیں تو ہماری کلاس شروع ہو۔ کلاس بہر حال شروع ہوتی تھی اور پھر کرار صاحب ہندوستان کی ساری سیاست کو یکسر فراموش کر کے ادب پر شروع ہو جاتے تھے۔ کلاسیکی ادب تک خوش' بہت خوش' خاص طور پر میر کی غزلیں انہیں بہت رجھاتی تھی۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ وہ میر کے بعد راشد کے بھی قائل ہو جائیں مگر وہ تو سارے نئے ادب ہی سے بیزار تھے۔

ساقی پڑھتے پڑھتے انہوں نے الگ رکھا "اس بھلے مانس کو کیا ہوا ہے۔ جوائس پر لکھے چلا جا رہا ہے۔"

"جی' محمد حسن عسکری تو نئے ادب کے ساتھ بہت بڑے نقاد ہیں۔"

"مگر بابا اردو میں جوائس پر لکھنے کی تک کیا ہے؟"

اور ایک روز میں نے انہیں جا کر اطلاع دی کہ جس نقاد سے آپ جوائس پر لکھنے کی وجہ سے خفا ہیں' وہ آپ کا شاگرد رہ چکا ہے۔ آج کل وہ میرٹھ ہی میں ہے۔"

کرار صاحب کے بار بار ذکر پر عسکری صاحب نے آخر ایک شام مجھے بتایا کہ انہوں نے انٹر میرٹھ کالج ہی سے کیا تھا اور وہ کرار

صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ پھر کرار صاحب سے ان کی ملاقات بھی ہوئی اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔

کرار صاحب انہی دنوں اردو کے اس زمانے کے نقادوں کو جیسے تیسے پڑھ رہے تھے۔ فراق کی ''اردو کی عشقیہ شاعری'' بھی پڑھ ڈالی۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے ''لگتا ہے کہ کوئی بھلا مانس انگریز اردو غزل پر بات کر رہا ہے۔''

عسکری صاحب سے بے تکلفی بڑھی تو ایک روز سادگی سے ان سے پوچھا ''عسکری تم نے مجنوں کی تنقید پڑھی ہے؟''

جی پڑھی ہے۔''

''احتشام حسین کو بھی پڑھا ہے؟''

''جی۔''

''اور آل احمد سرور۔ اس نقاد کو بھی پڑھا ہے۔''

''جی۔''

''اچھا؟'' کرار صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں حیرت کا اظہار کیا ''عسکری! تم بہت پڑھتے ہو۔''

ویسے عسکری صاحب کا اس فضا میں ایک اثر تو میں نے دیکھا۔ مسلم لیگ کی سیاست پر یہاں جو درشت تنقید ہوتی تھی' اس کے لہجہ میں اچھی خاصی نرمی آ گئی تھی۔ ادھر عسکری صاحب نے ''الامین'' میں لکھنا بھی شروع کر دیا تھا ''الامین'' کے مخالص خاکساری لہجہ کے بیچ مسلم لیگی لہجہ بھی در آیا۔

کرار صاحب نے پاکستان پہنچ کر پہلا پڑاؤ لاہور میں کیا۔ ایک رات داتا دربار میں گزاری۔ دوسرے دن راوی پار جا کر گاما پہلوان سے ملاقات کی۔ تیسرے دن کراچی چلے گئے۔

خیر کرار صاحب تو پاکستان آ گئے مگر مجھے میرٹھ کا ذکر تھوڑا اور کر لینے دیں۔ ارے ابھی تو مجھے ظ۔ انصاری کا ذکر کرنا ہے اور اپنے قیصر زیدی کا اور ہاں لیجئے بوم ہاپوڑی کو تو میں بھول ہی چلا تھا۔ میں جب کالج کی چھٹیوں میں ہاپوڑ جانے کے لیے لاری کے اڈے پر پہنچتا تو دیکھتا کہ ایک شخص گوری رنگت' سارا سر سفید' ہاتھ میں بہت سے کتابچے صدا لگا رہا ہے۔ بوم ہاپوڑی کا کلام لے لو۔ چماری نامہ ایک آنے میں۔ یہ شخص جو صدا لگا رہا ہے' خود بوم صاحب ہیں۔ اپنا کلام کتابچوں کی شکل میں خود چھاپتے ہیں۔ خود بیچتے ہیں۔ میرٹھ کا بچہ بچہ انہیں پہچانتا ہے۔ ایک گلی سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکوں بالوں نے بوم صاحب کو گھیر رکھا ہے۔ ''بوم صاحب چماری نامہ سنیں گے۔'' بوم صاحب نے جواب میں آنکھیں موند لیں اور لیجئے شروع ہو گئے۔

ان حسینوں نے اجاڑیں بستیاں
بوم سالا مفت میں بدنام ہے

مرے ڈسنے کو ظالم تو نے کیسے ناگ پالے ہیں
ترے اوپر بھی کالے ہیں تیرے نیچے بھی کالے ہیں

بوم صاحب باپوڑ میں چونگی کے محرر تھے۔ اچھا کماتے تھے مگر ہوا یہ کہ ایک چماری سے تحصیلدار صاحب کے ناجائز تعلق کا سکینڈل چلا تو موصوف نے چماری نامہ لکھ ڈالا۔ اس چکر میں نوکری گنوادی۔ اب میرٹھ کے لاری اڈے پر کھڑے ہو کر اپنے کلام کی بولی لگاتے تھے اور پیٹ بھرنے کا سامان کرتے تھے۔

اور ہاں قیصر زیدی۔ کیا بانکے آدمی تھے۔ میرٹھ میں اگر کوئی ایسا تھا جسے انٹلیکچوئل کہہ سکیں تو وہ یہ تھے کیا خوب سج دھج تھی۔ سدا ایک ہی لباس' گیروئے رنگ کے کھدر کا کرتا' اسی کھدر کا چوڑے پائنچوں والا پائجامہ۔ بال زلفوں والے مگر ہر چیز نفاست کے ساتھ۔ خوش شکل' خوش گفتار' اس غزل زدہ شہر میں وہ نظم آزاد کہنے والے واحد شاعر تھے۔ ایک افسانہ بھی لکھا تھا جو انہیں زبانی یاد تھا۔ جب سناتے تو اس کے لیے خاص اہتمام کرتے۔ چائے کی پوری کیتلی اپنے لیے الگ محفوظ کر لیتے۔ لیمپ بجھا دیا جاتا۔ پھر افسانہ شروع کرتے۔ جب افسانہ ختم کرتے تو فوراً ایک بیان شروع ہوتا۔ ''جب افسانہ ختم ہوا تو پردے کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ زبیدہ بے ہوش ہو گئی تھی' عابدہ سسکیاں لے رہی تھی۔''

میں نے جب انہیں دیکھا تو وہ تعلیم سے فارغ ہو کر میرٹھ کا روڑا بن چکے تھے۔ خیال یہی تھا کہ نہ ملازمت کریں گے' نہ شادی کریں گے۔ نہ میرٹھ سے قدم باہر نکالیں گے مگر اچانک تینوں ہی کام ایک سانس میں کر ڈالے۔ کسی دوست کی شادی میں براتی بن کر گئے تھے۔ وہاں کوئی جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ پہلے انہوں نے دوست کو اور اس کے والدین کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ جب ان کی سمجھ میں بات نہ آئی اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو جوش میں آ کر اپنے آپ کو بر کے طور پر پیش کر دیا۔ انہیں دنوں جامعہ ملیہ میں جا کر استاد بن گئے۔ بس پھر دلی ہی کے ہو رہے۔ جب دلی سے میرٹھ آتے تو ڈاکٹر ذاکر حسین کے گن گاتے ہوئے آتے۔

لوگوں کے ناموں میں انہیں بالعموم کوئی مضحک پہلو نظر آ جاتا تھا۔ ایک روز کہنے لگے ''انتظار میاں ہمارا ایک بھانجا ہے۔ شاعری کرتا ہے' پتہ ہے اس نے تخلص کیا رکھا ہے ''تیغ'' ایک لمبا قہقہہ۔ پھر بتاتے کہ ''موصوف ابھی پڑھ رہے ہیں اور مجموعہ بھی چھپوا لیا ہے۔ الہ آباد میں پڑھتے ہیں' اس لیے تیغ الہ آبادی بن گئے ہیں۔''

پھر ایک روز بولے ''ظوئے کیسا نام ہے۔ کبھی ایسا نام سنا ہے۔ والدین نے ظل حسنین نام رکھا تھا۔ اس روایتی نام پر حضرت کو شرم آئی۔ ترقی پسندی کے جوش میں اسے مختصر کر کے ظوئے کر لیا۔ اب ظ انصری کے نام سے لکھتے لکھاتے ہیں۔ آئے ہوئے ہیں۔ چلو میں تمہیں ان سے ملاتا ہوں۔''

ظ انصاری ویسے تو میرٹھ ہی کے تھے مگر اس وقت وہ ایک مار میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ اپنے شہر کو ٹوہ کر دیکھ رہے تھے کہ اس میں ترقی پسند تحریک کو قبول کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ مجھ میں انہوں نے کوئی گن دیکھا ہوگا کہ ساتھ لگا لیا۔ شہر میں لخ لخ پھرتے تھے۔ ان کے ساتھ لگا ہوا میں پھرتا تھا۔ اردو کے نام تو یہاں بس کچھ غزل گو تھے۔ وہ ترقی پسندی کے نام سے بدکتے تھے۔ ہاں ہندی والوں کے حلقہ میں ظ صاحب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ دو ڈھائی ہفتے کی دوڑ دھوپ کے بعد بال آخر ایک تقریب کا اہتمام ہوا۔ ہندی کہانیاں، نظمیں پڑھی گئیں۔ لیجئے میرٹھ میں پی ڈبلیو قائم ہوگئی اور ترقی پسند تحریک کا ڈول پڑ گیا۔

تو اب تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک کی تنک سی خدمت میں نے بھی کی ہے۔ ظ صاحب مجھ سے خوش ہو گئے تھے مگر برس بعد جب پھر ان کا میرٹھ کا پھیرا ہوا تو انہوں نے بدقسمتی سے ایسے وقت میں ہمارے گھر میں قدم رکھا کہ عسکری صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کا ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھول گیا۔ ظ صاحب جلدی ہی اٹھ گئے اور اس طرح رخصت ہوئی جیسے کہتے جا رہے ہوں مانس گند، مانس گند۔

پھر اس کے بعد لاہور میں ان سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ شاید ماسکو سے واپس آتے ہوئے ڈھائی تین دن کے لیے لاہور ٹھہرے تھے۔ ویسے تو وہ لیل و نہار کے دفتر میں سبط صاحب سے فراغت پا کر میری ہی طرف آئے تھے مگر میں انہیں ٹی ہاؤس لے گیا۔ بس وہاں صفدر نے انہیں لپک لیا۔ پھر وہ صفدر ہی کے مہمان بن گئے۔

اور اب مجھے جامعہ ملیہ کا میر سیمینار یاد آ رہا ہے۔ وہاں ظ صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی تقریر کچھ زیادہ ہی لمبی کھنچ گئی۔ میر پر بات کرتے کرتے اپنی ذات پر آ گئے۔ باقر مہدی نے کسمسانا شروع کیا۔ خیر ظ صاحب نے جلدی ہی اس عزیز کے لیے موقع فراہم کر دیا۔ کہنے لگے کہ ''میں اب اور کتنے دن زندہ رہوں گا، یہی کوئی دس برس۔''

باقر مہدی نے فوراً شور مچایا ''دس برس بہت ہیں۔ کم کرو، کم کرو۔''

اور لیجئے میر سیمینار ہی میں عمیق حنفی نے جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ بھی سن لیجئے۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے مقالہ میں میر اور اقبال کی شاعری میں مشابہتیں دریافت کی تھیں۔ سوالوں اور تبصروں کا سیشن شروع ہوا تو عمیق حنفی سٹیج پر آئے اور بولے کہ جگن